سید ذوالکفل بخاری اور میں

محمد افتخار شفیع

الفاظ سے میرا رشتہ خاصا پرانا ہے۔ یہ ہمیشہ میری دسترس میں رہے ہیں۔لیکن نہ جانے کیوں آج میرے قابو میں نہیں۔ میرے اندر شکست وریخت کے اِس عمل کی وجہ میرے ظاہری و باطنی اعمال کی تقسیم بھی ہے۔ بخاری صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے الفاظ نے بغاوت کردی ہے۔حواس کا باہمی ربط تعطل کا شکار ہے۔ میرے ذہن میں متعدد سوالیہ نشانات اپنی شدت کے ساتھ اٹھتے ہیں اور اپنے وجود کی نمود کے بعد آنِ واحد میں کہیں غائب ہوجاتے ہیں۔ واقعات گنگ ہیں۔ یادوں پر کہرا جما ہے اور تصورات کے آبگینے ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹنے کے منتظر ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے بس ایک زیرِلب تبسم کی ہلکی سی پھوار ہے جس نے ملتان سے حرمین تک کے ہر راستے کو کچی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک سے آباد کردیا ہے۔ ملتان کی کچی مٹی اور مکہ کی تقدس مآب پتھریلی زمین، دونوں کی خوشبوئیں اِس طرح باہم یکجا ہوئی ہیں کہ پہچان مشکل ہے۔ یہی جنت المعلیٰ کا قبرستان، مجھے اِس قبرستان میں جاروب کشی کی سعادت حاصل ہوچکی ہے۔ کسے خبر تھی کہ اِسی قبرستان میں ہمارے شاہ صاحب، ہمارے شاہ جی اور ہمارے سید صاحب کو بھی ایک قطعۂ اراضی الاٹ ہوگا۔

برادرم ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان نے جب ٹیلی فون پر مجھے سید ذوالکفل بخاری کے سانحۂ ارتحال کی خبر سنائی تو ہوش میں آنے کے بعد میرا پہلا سوال یہی تھا: ''بخاری صاحب کا جسدِ خاکی کب لایا جارہا ہے؟ اُن کا جنازہ کب ہوگا اور کہاں ہوگا؟'' وحید کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ کہنے لگے: ''ظاہر ہے جہاں کی مٹی تھی، وہیں دفن ہوگی۔'' آج جب میں اِس جملے پر غور کرتا ہوں تو ''وہیں کی مٹی'' والی بات ہر لحاظ سے سچ لگتی ہے۔ وہ مٹی واقعی حجاز کی تھی۔ اُس کی خوشبوئیں بھی مدینے سے نسبت رکھتی تھیں۔ یہ سطریں جو میں لکھ رہا ہوں، میرے دوست اور مرشد سید ذوالکفل بخاری کے لیے ہیں۔ شاہ صاحب بڑے دل دار، بڑے ہی جلیل ومکرم، بے ساختہ درویش اور دوست نواز قسم کے آدمی تھے۔ میں نے شاہ صاحب کا جنازہ نہیں پڑھا، اُن کی قبر کی زیارت نہیں کی۔ اِس لیے اب میرے لیے ہر قبر ذوالکفل بخاری کی قبر بنی ہوئی ہے۔ یہاں مجھے احسان دانش کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضورؐ کی

یہ بات سچ، لیکن غم کی کیفیت والہانہ ہوتی ہے۔ میرا اور بخاری صاحب کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ متمم بن نویرہ نے اپنے بھائی مالک بن نویرہ کی وفات کا مرثیہ لکھا تھا۔ اُس نے کہا تھا:

لقد لامنی عند القبور علی البکا　　رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال أتبکی کل قبر رأیتہٗ　　لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک
فقلت لہ، ان الشجا یبعث الشجا　　فدعنی، فہٰذا کلہ قبر مالک

اِن مراسم کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے اِن کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ اپریل ۱۹۹۶ء کی بات ہے جب میں لوئر مڈل کلاس کی روایتی سی ہچکچاہٹ میں مبتلا تلاشِ روزگار کے سلسلے میں ملتان پہنچا۔ ملتان کے ادبی ناموں تک میری رسائی فقط ایک قومی اخبار کے ادبی ایڈیشن کے سبب تھی۔ میں اُنھیں ملتان کا چہرہ سمجھتا تھا۔ یہ بات اور کہ اپنے دس سالہ قیامِ ملتان کے عرصے میں یہ لوگ مجھے بڑے ہی بودے اور ''بونا پارٹ'' قسم کے محسوس ہوئے۔ ملتان کی ادبی شناخت کچھ اور لوگ تھے۔ اِن ''اور لوگوں'' میں ایک نام بخاری صاحب کا بھی تھا۔ کسی زمانے میں ذوالکفل کا ایک خط ''سرِ راہے'' والے مشہور کالم میں شائع ہوا تھا جس میں کالم نگار کی کسی معاملے میں درستی کی گئی تھی۔ تب سے یہ نام بھی ''طاقِ نسیاں'' پر کہیں دھرا تھا۔

ایک دن کسی محفل میں گفتگو کے دوران ''ذوالکفل بخاری'' کا نام ایک دفعہ پھر سننے میں آیا۔ میں چونکا۔ ''ارے ہاں ہاں، یہ کون ہیں؟'' پتا چلا کہ آپ انگریزی کے لیکچرار ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے ہیں اور بڑے علمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہوگا کوئی زاہدِ خشک، ناصح، محتسب اور واعظ قسم کا آدمی۔ میرے اندر کے شاعر نے اپنا کلاسیکی غزل کا مطالعہ کھول کر رکھ دیا۔

پھر ایک شام ایسی آئی جب محمد مختار علی اور میں سنٹرل لاء کالج (ملتان) میں فاران اکادمی کے اجلاس میں پہنچے۔ مختلف لوگ پہلے سے ہی موجود تھے۔ مختار نے تعارف کروادیا۔ یہ نیلے شیشوں والا چشمہ لگائے اسلم انصاری بیٹھے ہیں۔ یہ دھیمے دھیمے انداز میں گفتگو کرنے والے پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان ہیں۔ یہ کھچڑی ڈاڑھی والے آدمی خالد مسعود خان ہیں جو تیز طرار لگتے ہیں لیکن ''ماٹھا کالم'' لکھتے ہیں۔ یہ سفید لٹھے کی کلف لگی شلوار قمیص پہنے، وقفے وقفے سے ہنسی کی پھلجڑی والے وحیدالرحمٰن خان ہیں۔ اور یہ ہیں ذوالکفل بخاری۔ کسی نے حیرتوں کے متعدد باب مجھ پر کھول دیے۔ سادہ سی شلوار قمیص، گلے میں گہرے رنگ کی چادر، سر پر ٹوپی، پیروں میں ہوائی چپل اور اُس میں چمڑے کے موزوں والے پاؤں۔ سنت کے مطابق ڈاڑھی، چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم۔ پہلا تاثر یقیناً مرعوب کن نہ تھا۔ گفتگو کا سلسلہ چلا۔ تنقید کے لیے پیش کیے گئے فن پاروں پر تبصرے ہوئے۔ ذوالکفل بخاری کی بے ساختہ گفتگو کے دوران وہ بات کررہے تھے اور میں ''اے ترکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای'' کی عملی صورت میں مبہوت بیٹھا تھا۔ اجلاس کے اختتام پر اُن کی علمیت، سادہ طبع اور مسحور کن شخصیت نے میرے دل میں گھر کرلیا تھا اور میں عجز و نیاز سے اُن کے پاس کھڑا تھا۔ اِس کے بعد ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ وہ پہلے مرحلے میں دوست اور پھر مرحلہ وار یار اور مرشد بنتے چلے گئے۔

فاران اکادمی سے مجھے پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان جیسے شفیق بزرگ اور ذوالکفل بخاری اور وحیدالرحمٰن خان جیسے مخلص دوست میسر آئے۔ ملاقاتوں کا یہ دور ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک روز اُنھوں نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ میں چند روز بعد سعودی عرب روانہ ہورہا ہوں۔ مجھے وہاں کے محکمۂ تعلیم نے انگریزی کے مدرس کے طور پر منتخب کیا ہے۔ مستحسن خیال کے گھر پر الوداعی دعوت ہے۔ وہ دوستوں کو کھانا دے رہے ہیں۔ آپ نے بھی اِس میں لازمی شریک ہونا ہے۔ اُس رات مستحسن صاحب کا گھر ''رونق کدہ'' بنا ہوا تھا۔ تادیر دوستوں کی گپ شپ جاری رہی اور ذوالکفل کو ''آہِ سرد'' کی غم ناک کیفیات کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ اُن دنوں میں اردو میں ایم اے کرچکا تھا، اور دورانِ تعلیم مجبوراً اختیار کرنے والے ٹیکسٹائل مل کے شعبۂ خریداری کی ملازمت سے بیزار تھا۔ شاہ جی میری اِس قلبی کیفیت کو سمجھتے تھے اور گاہے بگاہے مجھے اچھے مستقبل کی نوید دیتے رہتے تھے۔ ذوالکفل بخاری سعودی عرب چلے گئے، خان کو لاہور نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بزرگ اپنے اپنے گھروں میں معتکف ہوگئے۔ چند ماہ بڑی خاموشی کے ساتھ گزرے۔ شاہ جی مجھے سعودی عرب جاکر بھول چکے ہیں۔ یہ خیال اکثر آتا اور ملول کرجاتا۔ میں نے ابھی

عرض کیا ہے کہ میں نے ایم اے اردو کیا تھا۔ دل میں استاد بننے کی خواہش بھی موجود تھی۔ فاران اکادمی کے اجلاس میں ذوالکفل بخاری، خان اور مختار پارس جیسے نوجوان لیکچراروں کو دیکھ کر رشک کرتا تھا۔ میری تنخواہ شاید اُس وقت ''نئے آنے والے لیکچرار'' سے زیادہ تھی لیکن مسئلہ علمی معاملات سے وابستہ اور ذہنی طور پر آسودہ ہونے کا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں مجھے اپنی والدہ کے ہمراہ عمرے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم ''باب السلام'' کے راستے حرم شریف میں داخل ہوئے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کعبے کو دیکھ کر جو دعا سب سے پہلے مانگی جاتی ہے وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ مالک کے حضور یہ دعا تو بہت چھوٹی تھی لیکن میں نے اپنے لیے ''تدریس'' کا شعبہ مانگا۔ میں ابھی مکے میں ہی تھا کہ ایک روز مجھے پتا چلا کہ ٹیکسٹائل مل والی ملازمت کو خطرہ ہے۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے پروفیسری مانگی اور تو نے مل مزدوری بھی خطرے میں ڈال دی۔ مکہ اور مدینہ میں اپنے قیام کی مدت پوری کر کے جب میں ملتان واپس پہنچا تو ''مل مزدوری'' واقعی خطرے میں تھی۔ میں شعبۂ خریداری میں ایک ایمان دار اور سخت افسر کے طور پر ''ناپسندیدہ'' تھا اِس لیے اپنے شعبے کے لوگوں اور مل کے فورمینوں کی سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ میری ایمان داری اب اُن کی نظروں میں مشکوک ہو چکی تھی۔ میرا سارا دفتری کام التوا کا شکار تھا۔ میری ایمان داری اور محنت کی مثالیں دینے والا مل مالک ایک دن مجھے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ''آپ کا عمرہ ہمیں بہت مہنگا پڑا ہے۔''

میں اب اِس ملازمت کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ یہی دن تھے کہ جب ایک روز بہت عرصے کے بعد مجھے سید ذوالکفل بخاری کا فون آیا۔ وہ چھٹی پر ملتان آئے ہوئے تھے اور انھوں نے میرے لیے ملتان کے ایک اہم پرائیویٹ کالج میں ملازمت ڈھونڈ لی تھی۔ شاہ جی کا حجازِ مقدس سے آ کر میرے لیے متعلقہ نوکری کا انتظام کرنا، دراصل میری دعا کی قبولیت کا ثمرہ تھا۔ دعا چوں کہ حجازِ مقدس میں کی گئی تھی لہٰذا مشکل حالات میں کمک بھی اُسی سرزمین سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا نواسہ لے کر پہنچا تھا۔ اب مشکل مرحلہ یہ تھا کہ ''کیا میں کلاس پڑھا پاؤں گا؟'' ''کنٹرول کر سکوں گا؟'' شاہ جی نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ انھوں نے کہا ''میں اور پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان صاحب آپ کی مدد کریں گے۔'' پہلے مرحلے پر مجھے حفیظ صاحب کے ہاں بھیجا گیا۔ ان سے مجھے تدریس اردو سے متعلق ہدایات ملیں اور اس کے بعد شاہ جی کے ہاں جا پہنچا۔ انھوں نے اپنے طور پر میری Demonstration لی۔ میں ان کی سادہ سی بیٹھک میں کھڑا ہو کر انھیں لیکچر دے رہا تھا اور وہ واحد سامع کی حیثیت سے آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ بیس منٹ بعد انھوں نے ''ہاں'' کہی۔ یہ اِس بات کا اظہار تھا کہ میں استاد بننے کے قابل ہوں۔ پنجاب کالج ملتان کی شعبۂ اردو کی ملازمت کا اہتمام ذوالکفل بخاری نے کیا تھا۔ وہاں دو سال گزارنے کے بعد جب میری پنجاب پبلک سروس کمیشن کے تحت محکمۂ تعلیم حکومتِ پنجاب میں بطور لیکچرار (اردو) کا انتخاب ہوا تو وہاں سے فراغت کے لیے بھی شاہ صاحب ہی میرے ہمراہ تھے۔ اُن دنوں بھی وہ چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔

فاران اکادمی کی سرگرمیاں چوں کہ تعطل کا شکار تھیں۔ میں نے فرصت میسر آتے ہی اِسے دوبارہ متحرک کیا۔ پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کی شفقت بھی میرے ہمراہ تھی۔ شاہ جی سعودی عرب سے آئے تو کہنے لگے ''اسلام آباد پہنچتے ہی مجھے مختار پارس نے بتایا کہ فاران اکادمی پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔'' پھر مجھے کہنے لگے ''آپ سے اِس کی تو بہر حال توقع تھی۔'' یہ جملہ اُنھوں نے اِس انداز سے بولا کہ ادائیگی کے لحاظ سے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ مجھ پر آج بھی طاری ہے۔

وہ شہر کی ادبی فضا میں تحرک کے خواہش مند تھے۔ کم کم سہی لیکن ادبی اجتماعات میں وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی وہ ناصح نہیں بلکہ دوست بن کر لامحسوس طریقے سے میری تربیت کرتے۔ ایک دفعہ عرش صدیقی اکیڈمی کے

مشاعرے کے بعد (جس کی صدارت مستنصر حسین تارڑ کر رہے تھے) وہ مجھے ایک طرف لے گئے۔ کہنے لگے آپ کی غزل میں ہندی ڈکشن کا استعمال کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ فارسی تراکیب سے بھی لگاؤ پیدا کریں۔ اِس کے بعد انھوں نے فارسی کی تہذیبی، مذہبی اور فکری اہمیت پر تفصیل سے گفتگو کی۔

محکمۂ تعلیم میں میرا پہلا تقرر گورنمنٹ کالج فورٹ عباس میں ہوا، اور میں ملتان سے اپنے گھر ساہیوال پہنچنے کی کوشش میں گھر سے اور بھی دور ہوگیا۔ صحرا کی زندگی میں دن کو غزال اور رات کو مہتاب دیکھتے دیکھتے آخر میں اُکتا گیا۔ میں نے ایک دن ذوالکفل کو فون کیا اور کہا شاہ صاحب! صحرانشین ہوکر تو میں بالکل ہی تنہا ہوگیا ہوں، ملتان میں گھر سے دور تھا تو کم از کم حفیظ الرحمٰن خان اور جاوید اختر بھٹی کی صحبتوں سے لطف اندوز تو ہوتا تھا اور یہاں تو وہ بھی نہیں رہیں۔ اُنھوں نے مجھے حوصلہ دیا، وعدہ کیا کہ میں جب بھی پاکستان آیا تمھارے پاس فورٹ عباس ضرور آؤں گا۔ سنا ہے وہاں ہرن کا شکار ہوتا ہے۔ مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں وہ صرف میری ہمت بڑھانے کے لیے کر رہے تھے۔ ورنہ اب صحرا، کہاں وہ صحرا رہے ہیں:

ہم اہلِ ہجر کو صحرا ہی ایک رستہ تھا
اب اُس طرف سے بھی خلقِ خدا گزرتی ہے

شاہ جی کے آنے سے پہلے ہی میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں ہوگیا۔ اب میں ذہنی طور پر نہایت آسودہ تھا۔ ایک دفعہ ملتان کا چکر لگا تو جاوید اختر بھٹی صاحب کی معیت میں شاہ جی کے ہاں پہنچا۔ کہنے لگے:

> افتخار صاحب! مجھے اِس بات کی نہایت خوشی ہوئی ہے کہ آپ ساہیوال پہنچ گئے ہیں۔ اب آپ ایک اچھے تعلیمی ادارے کے استاد ہیں۔ ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ لائق شاگردوں کا ایک حلقۂ اثر پیدا کرے۔ ساہیوال کالج کو ہی لے لیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی جب بھی کہیں کوئی انٹرویو دیتے ہیں اپنے ساہیوال کے استاد ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق کا ذکرِ خیر ضرور کرتے ہیں۔ یہ ہے ایک استاد کی معراج۔

وہ خود بھی ایک اچھے استاد تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے دوست بھی ان جیسے بن جائیں۔ اُملج جیسے دور دراز کے قصبے سے ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں اُن کا تقرر ہونا اُن کے اچھا استاد ہونے کا ثبوت ہے۔ جب سید ذوالکفل بخاری آخری دفعہ ملتان آئے تو میں بھی ملتان گیا۔ اتفاق سے وحیدالرحمٰن خان بھی آئے ہوئے تھے۔ میں وحیدالرحمٰن اور توحیدالرحمٰن کے ہمراہ اُن کے پاس گیا۔ بڑی دیر تک گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد میں نے اجازت لی اور بھٹی صاحب (جاوید اختر بھٹی) کے فرزند، حسن کے ساتھ ان کے والد صاحب سے ملاقات کی خاطر چل پڑا۔ ذوالکفل بخاری بھی پطرس بخاری کی طرح ہمارے حلقے کے ''بخاری'' تھے۔ دونوں اپنے اپنے حلقے کے مرشد تھے۔ دونوں انگریزی کے استاد تھے۔ دونوں بیرونِ ملک، ملکِ عدم کو سدھارے اور اپنے اپنے مزاج کی مٹی کا رزق بنے۔ میرا جو تعلق اپنے اِس ''دوست نما مرشد'' سے ہے اُس کا احاطہ کرنا اِن چند صفحات میں ممکن نہیں۔ اِس کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ یہ مضمون تو عاجلانہ انداز میں لکھا جا رہا ہے۔ میری آنکھیں تر ہیں اور دل بوجھل ہے، ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ الفاظ میرے قابو میں نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ جب اگلے جہان میں اُن سے ملاقات ہوگی تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہیں گے: ''آپ سے اِس کی تو بہرحال توقع تھی۔''